حاصلِ مطالعہ

محمد بشیر ہرل

تصوف (ایک تعارف)

پسِ منظر:

۲۱ نومبر ۲۰۱۱ء

فلسفہ یعنی عقلیت پسندی اور تصوف یعنی باطنیت ، دونوں تصورات کی ابتدا یونانی مفکرین سے ہوئی ۔ فیثا غورث باطنیت یا تصوف کا بانی تھا ۔ اس کے بعد افلاطون نے یہ دونوں اعتقادات آگے بڑھائے لیکن اس کی شہرت باطنیت کی وجہ سے ہوئی ۔ چنانچہ بجا طور پر افلاطون کو تصوف کا بانی سمجھا جاتا ہے ۔ مسلمان افلاطون وغیرہ کے خیالات سے اس وقت آگاہ ہوئے جب مامون الرشید کے عہد میں یونانی علماء اور فلسفیوں کے لٹریچر کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ۔ افلاطون مادی دنیا کو فریبِ تخیل ، اور عالمِ امثال کو حقیقی وجود تصور کرتا تھا ۔ اس کا کہنا تھا کہ مادی پیکر میں آنے سے پہلے انسانی روح بھی اسی عالمِ امثال میں مقیم تھی ۔ مادی دنیا میں آ کر اس روح میں عالمِ امثال کی دھندلی سی یاد باقی رہ جاتی ہے ، اور تعلیم کا صحیح مقصد ہی یہ ہے کہ روح کے اس حافظہ کو تقویت دی جائے تا کہ حافظہ روحِ حقیقی کو پہچان لے ۔ اس نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ روحِ حقیقی کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا اسے صرف پہچانا جا سکتا ہے ۔ اسے عرفان یا معرفت کہتے ہیں ۔ اور جس طریقے سے یہ معرفت حاصل ہوتی ہے اسے وجدان یا کشف والہام کہہ کر پکارتے ہیں ۔ عربی مسلمان افلاطون وغیرہ کے خیالات سے اس وقت آگاہ ہوئے جب مامون الرشید کے عہد میں یونانی لٹریچر کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور ابنِ عربی اور امام غزالی کے تصورات سامنے آئے

روح:

یونان میں مادی دنیا کے کثیف بلکہ سراب ہونے کا تصور عام ہوا تو فیثا غورث نے اس کی ضد ، ایک ایسے عنصر کا تصور پیش کیا جسے اس نے روح سے تعبیر کیا ۔ یوں روح اور مادہ کے دو الگ الگ چیزیں ہونے کا تصور وجود میں آیا ۔ یہی تصور بعد میں ایران میں رائج ہوا اور ہندی تصوف کی بھی بنیاد قرار پایا ۔ انہوں نے جب اس عالمِ رنگ و بو کو غیر حقیقی اور سراب تسلیم کر لیا تو کسی حقیقی وجود کے طور پر پرم آتما (پر ماتما) یعنی روحِ کُل کا عقیدہ وضع کیا ۔ کہ انسان کی روح بھی اسی روحِ کُل یا وجودِ حقیقی کا جزو ہے جو مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے ، اور ترکِ دنیا سے یہ آلائش دور ہو جائیگی جس کے لیے روح کو آواگون کے چکروں سے گزرنا پڑے گا ۔ عین یہی عقیدہ فیثا غورث کا تھا ۔ کہ اس طرح جب یہ روح مادی کثافت سے پاک ہو جائے گی تو پھر یہ جزو اپنے کُل میں جا ملے گا ۔ اسے انہوں نے نجاتِ ابدی یا مکتی کا نام دیا ۔

روح یا نفس کا قرآنی حکم:

قرآنِ کریم بہ صراحت واضح کرتا ہے کہ روح یا نفس ، خدا کا عطا کردہ وہ ملکہ ہے جس سے انسانی اختیار اور ارادہ کی نمو ہوتی ہے ۔ یہ تصوف کی "روحانیت" سے بالکل مختلف تصور ہے ۔ "روحانی" ترقی کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آتا ۔ حتیٰ کہ حضور صلعم کے متعلق بھی "روحانی درجہ" کا کوئی ذکر نہیں بلکہ یہ کہا گیا کہ "اے رسول ، بے شک تو انسانی اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہے ۔" ۔

عالمِ امثال:

افلاطون کہتا تھا کہ عالمِ محسوس کے اوپر جو عالمِ امثال ہے ، اس کا وجود حقیقی ہے ، اور یہ عالم محض اس کا پرتو ہے ، اور اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے ، محض سراب ہے ۔ اس کے اس تصور کے اثرات یہودیوں کے تصوف پر بھی ہوئے اور اُن میں تورات کے ظاہری معانی اور باطنی معانی کا تصور وجود میں آیا ۔ چنانچہ یہودی صوفیوں کے عجیب و غریب قصے شروع ہو گئے ، جن میں ان کی کرامات اور فوق الفطرت باتیں منسوب ہو گئیں ۔ ان کے یہ "اربابِ تصوف" الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات سے کرتے ، خوابوں کی تعبیر سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے ، اور آنے والے واقعات کی خبر دیتے ۔ جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو یہ تصوف یہودیوں میں عام تھا ۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم ان فضول تصورات کے خلاف تھی ۔ یہ ہی وجہ تھی کی یہودی پیشوائیت اُن کی جانی دشمن ہو گئی ۔ ستم یہ ہے کہ حضرتؑ کے تشریف لے جانے کے بعد خود عیسائیت بھی انہی تصورات کا مرقع بن کر رہ گئی ۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ عیسائی مذہب اختیار کرتے وہ اکثر پہلے یہودی ہوتے تھے ۔ جسطرح ہندو پاک میں ہندو تصورات روزمرہ کے اسلام میں در آئے ہیں ۔

لفظ صوفی:

لفظ صوفی یا تصوف کا عربی زبان میں کوئی وجود نہیں ۔یہ لفظ نہ قرآن میں موجود ہے نہ حدیث میں اور نہ ہی کسی صحابی نے یہ لفظ استعمال کیا۔صوفیوں کی پہلی خانقاہ ۱۴۰ھ میں فلسطین میں، یروشلم سے ۱۶ کلومیٹر شمال کی طرف، رملہ کے قریب قائم ہوئی ۔یہ نام سب سے پہلے اسی خانقاہ میں مقیم گدڑی پوشوں نے اختیار کیا جو فلسطین میں مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت اور خفیہ نگرانی کے لئے ایک گروہ کی شکل اختیار کر گئے تھے ۔اس کے بعد بہت سے لوگوں کے ساتھ لفظ صوفی دیکھنے میں آیا۔اس کی اصل یونانی لفظ Sophia بیان کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے عقل و دانش ۔لفظ فلسفہ میں بھی Philosophy شامل ہے۔بعض لوگ اسے لفظ صُوف سے مشتق سمجھتے ہیں جس کے معنے موٹی اون کے کمبل نما کپڑے کے ہیں ۔رملہ کے صوفی ایسا ہی موٹا جھوٹا کمبل اوڑھتے تھے ۔

ہندوستانی تصوف:

ہند میں ویدانت یعنی تصوف کا تصور ہمیشہ سے موجود تھا جس کا سب سے بڑا مبلغ شنکراچاریہ ہے اس کے نزدیک اصل علم " آتم ودھی "یا "معرفت نفس " ہے ۔وہ روح کو ازلی اور غیر فانی مانتا ہے اور خارجی کائنات کو فانی ۔وہ کہتا ہے کہ برہما ادراک سے بالاتر ہے ۔اور اس کی حقیقت شعور سے نہیں بلکہ وجدان سے معلوم ہو سکتی ہے ۔کائنات اور اس کی تمام اشیاء مایا یعنی سراب ہیں ۔(ذرا ابن انشا کی معروف نظم " سب مایا ہے "ذہن میں لائیں اور سوچیں کہ کس طرح مایا کا یہ افلاطونی اور شنکراچارین تصور ہمارے روزمرہ میں گھس چکا ہے) ترکِ خواہشات کے ذریعہ انسان مایا کے فریب سے نکل سکتا ہے ۔ویدانت کے مطابق خدا کی روح کا ایک جز و انسانی پیکر میں پہنچ کر مادہ کی دلدل میں پھنس گیا ہے اور نہایت کرب و اذیت کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔انسانی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ترکِ علائق کے ذریعہ روحِ خداوندی کو اس دلدل سے آزادی دلائی جائے ۔تا کہ یہ جز و اپنے کُل سے جا ملے ۔

ہندی مسلمان اور تصوف:

البیرونی جیسا عالی دماغ، غزنوی عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا تو ضلع جہلم میں ہندو پنڈتوں سے سنسکرت زبان سیکھی، اور ہندوؤں کی بیشتر اہم کتابوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ کیا۔اس طرح یہاں کے مسلمان پہلی بار یوگ کی تعلیم سے آشنا اور اِن تصورات سے آگاہ ہوئے ۔البیرونی کے بعد اکبر اعظم نے (بین المذاہب ہم آہنگی کے نام پر) مہا بھارت اور رامائن وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔اُس کے بعد دارا شکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اُپنیشدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کرا کے اسکا نام "سرّ اکبر" رکھا، اور ستم یہ کہ اس کے مقدمہ میں لکھا کہ قرآنِ کریم میں جس " کتابِ مکنون " کا ذکر آیا ہے وہ اُپنیشد ہی ہیں ۔پھر اس نے "یوگ بششٹ" کا فارسی ترجمہ کرا دیا اور اس کا نام "منہاج المساکین "رکھا۔اِن کتابوں میں وحدت الوجود کا فلسفہ اس کی شدید ترین شکل میں بیان کیا گیا ہے، جو کہ تصوف کی بنیادی اینٹ ہے ۔چونکہ یہ تراجم فارسی زبان میں تھے، اور انہوں نے تصوف کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا، اس سے " متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی " اُدھر سلسلہء قادریہ کے صوفیاء نے چلّے اور مراقبے کا رواج ڈال رکھا تھا، جو ہندو ویدانت کا طریق تھا اور ہندو سنیاسیوں اور جوگیوں کا معمول تھا ۔سلسلہء قادریہ کے مشہور صوفی، حضرت میاں میر (لاہور والے) تصورِ تصوف میں دارا شکوہ کے ہم خیال تھے ۔اس سے دارا شکوہ کے ویدانت پر مبنی عقائد ہندوستان، خاص طور پر پنجاب میں عام ہو گئے اور عوام میں یہ نظریہ شد و مد سے پھیلایا گیا کہ ہندو ویدانت اور مسلمان تصوف کا تصورِ وحدت الوجود، دونوں ایک ہی ہیں ۔ رام بھی وہی ہے اور رحیم بھی وہی ۔اِدھر شاہ عنائت قادری نے چلّے اور مراقبے وغیرہ کے طریقے کتابی شکل میں تحریر کر دیئے، جو ہندو یوگی مُکتی حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے تھے ۔اس سے " بھگتی" کی خطرناک تحریک ابھری، جس کا پیغام بظاہر محبت اور وحدت الوجود (ویدانت) تھا۔رام اور رحیم کے ایک ہونے کا پرچار تھا۔مثلاً بھگت کبیر نے کہا، ۔ گنگا ایک گھاٹ بہتیرے ۔۔کہت کبیر عقل کے پھیرے ۔ آگے چل کر انہیں میں سے گورو نانک پیدا ہوئے، جس نے ہندو اور مسلم مذاہب کا ملغوبہ بنا کر سکھ مذہب جاری کر دیا۔جب گورو نانک نے ہوش سنبھالا، اس دور میں بھگت کبیر وغیرہ کے چیلے، سادھو، ملنگ عام ہو چکے تھے جو گلی گلی گھومتے پھرتے اور عام فہم الفاظ میں اشعار، بند، اور کویتائیں پڑھ کر خود بھی ناچتے اور ان پڑھ لوگوں کو بھی نچواتے ۔بعضے تو ننگ دھڑنگ رہتے، بھنگ چرس پیتے، اِک تارے بجاتے، اور عوام کے لئے کشش کا سامان بہم پہنچا کر رام اور رحیم کے ایک ہونے کا پیغام عام کرتے تھے ۔جاہل عوام، عربی کے اسلام اور سنسکرت کے ہندومت، مولویوں اور پنڈتوں کی گرفت سے آزاد، بے عملی، سہل انگاری اور سُرتال سے خوب متاثر ہوئے ۔، اور بے عملی پر مبنی تصوف کے فریفتہ ہوتے گئے ۔ پھر بعد میں بلھے شاہ، شاہ حسین، بابا فرید، سلطان باہو، شاہ لطیف بھٹائی، سچل سرمست اور شہباز قلندر جیسے معروف صوفیاءِ کرام نے عام فہم زبان میں ایسا والہانہ کلام کہا جو عوام کے دِلوں میں ایسے اترتا چلا گیا کہ اسلامی شعائر کا نام

ونشان اِس غبار میں گُم ہوگیا۔حتیٰ کہ بات فرقہ ءملامتیہ تک جا پہنچی تو ہر قسم کی شرعی پابندیاں سرے سے ہی اُٹھ گئیں ۔کوئی بزرگ جس قدر فواحش ومنکرات کا مرتکب ہوتا، وہ اُتنا ہی پہنچا ہوا قرار پاتا ۔ شاہ مدار کے مداری، لال شہباز قلندر کے ملنگ، گوگا پیر کے الف شاہی، بوعلی قلندر کے مست ملنگ، اور مولیٰنا روم کے رقاص، سب مقربین بارگاہِ خداوندی قرار پا گئے، اور اسلام جو تدبر وتفکر اور عمل کا درس دینے آیا تھا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔بھگت کبیر تو ایک طرف، خود بلھے شاہ، شاہ حسین اور خواجہ فرید وغیرہ کے "عارفانہ" کلام کس قدر مقبول ہیں۔اِن بزرگوں سے ایسی ایسی فوق الفطرت کرامات منسوب ہیں کہ الامان والحفیظ ۔(چند کرامات کا تذکرہ اس مضمون میں شامل کیا جا رہا ہے)۔

اسلام اور تصوف:

اسلام کے اولین ڈیڑھ سو سال میں تصوف کا تصور نا پید تھا۔(یہودیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ تو راۃ کے ظاہری الفاظ نہیں بلکہ باطنی مطالب اصل حقیقت ہیں جو صرف خاص خاص ربائیوں کو معلوم ہیں۔لیکن اسلام میں اس عقیدہ کا وجود تک نہ تھا)۔ہمارے اولین ڈیڑھ سو سال میں وحی متلو اور وحیِ غیر متلو کی اصطلاح کا وجود بھی نہیں ملتا۔اسے امام شافعی نے متعارف کروایا تھا جو ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ھ میں مصر میں انتقال فرما گئے ۔ہارون الرشید کے دور میں یہ یمن میں مقیم تھے۔شریعت سے اعراض کا رجحان اس" تصوف" کا براہِ راست نتیجہ ہے۔حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ قدیم صوفیاء کا عقیدہ تھا کہ شریعت تو محض ایک مظہر ہے اور حقیقت کا ایک پردہ ہے۔اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔قدیم یونانی اور ایرانی تصوف کی تعلیم ہے کہ گردوپیش کے حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔تصوف ایک ایسی زاہدانہ ورراہبانہ زندگی گزارنے پر مائل کرتا ہے جو دراصل زندگی سے فرار، معاشرہ اور معاشرتی مسائل سے لاتعلقی کے مترادف ہے،لیکن اسلام نے دین ودنیا کے فرائض کو یکجا کیا ہے۔اور اسطرح بنی نوع انسان کے لئے ایک معتدل راہ متعین کی ہے۔جہاں یہ سکھایا ہے کہ تمہارا مقصودِ اصلی اعلائے کلمۃ الحق ہے، وہاں یہ بھی تعلیم دی ہے لا تنس نصیبک فی الدنیا۔یعنی دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر۔" ترکِ دنیا جہالت، والا عتماد علیها، شرك"۔

تصوف کی اصل اور بنیاد اِس عقیدہ پر ہے کہ علم بالحواس (عقل وفکر) قابل اعتماد علم نہیں۔یقینی اور قابلِ اعتماد علم وہ ہے جو براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے اور جسے کشف و الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اسکی رُو سے انسان ذاتِ خداوندی کی نہ صرف معرفت حاصل کر لیتا ہے بلکہ مشاہدہ بھی کر لیتا ہے۔ یہ عقائد اپنی اصل کے اعتبار سے ہی قرآن کے خلاف ہیں۔یہ اسی عقیدت مندی کا کرشمہ ہے کہ ہم بڑے بڑے دانشوروں کو، چرسیوں، بھنگیوں، ملنگوں، حتیٰ کہ مجذوبوں کے آستانوں پر سرنگوں دیکھتے، اور، مٹی وپتھر کے ٹکڑوں کے سامنے سَر جھکائے پاتے ہیں۔اسلام ایسے تصوف کے بھی خلاف ہے اور رسمی (مکینیکل) شریعت کے بھی خلاف ہے۔وہ ایک مکمل نظامِ حیات اور ضابطہءزندگی ہے۔جسے "روحانیت" کے نام سے پکارا جاتا ہے، وہ دراصل ایک اکتسابی صلاحیت ہے جو مشق سے بڑھائی جا سکتی ہے۔اور یہی وہ سحر ہے جس نے صدیوں سے اِس امت کی فکری صلاحیتوں کو محض تصوراتی طلسمِ ہوش رُبا میں غرق کر رکھا ہے۔تصوف کی رُو سے کائنات کا اپنا کوئی وجود نہیں بلکہ یہ محض وہم وقیاس ہے۔وجود صرف خدا کا ہے۔عالمِ وجود کی ہر شے، انسانوں سمیت، خدا ہی ہے۔یہ نظریہ وحدت الوجود کہلاتا ہے۔کائنات محض وہم وقیاس ہے لیکن انسان چونکہ رُوحِ خداوندی کا حامل ہے، اس لیے اس کا وجود ہے۔ رُوحِ خداوندی جس کا حامل انسان ہے، خدا کی روح کا جزو ہے۔مقصودِ حیات اس جزو کا اپنی اصل میں مدغم ہو جانا ہے۔یہ فنا کا نظریہ ہے۔دوسرا نظریہ اتصال کا ہے۔انسانی روح اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور اس قدر پختگی حاصل کر لیتی ہے کہ خدا کو جا ملتی ہے، لیکن اس کی ذات میں مدغم نہیں ہوتی۔یہ تصوف کی بنیادیں ہیں۔ان میں سے کسی ایک کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو وہ تصوف کو تسلیم کرنا کہلائے گا۔تصوف کی دو اخلاقی شناختیں ہیں۔ایک قسم ضعف وناتوانی، لاچاری ومجبوری کی تعلیم دیتی ہے۔دوسری قسم جوش اور حرارت پیدا کرتی ہے۔ تصوف کا ایک مخصوص اور منفرد عقیدہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کا اصل مفہوم وہ نہیں جو اس کے الفاظ کے معنی سے متعین ہوتا ہے۔ان الفاظ کے حقیقی معنی ان کی تہہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔اور یہ پوشیدہ معنی علمِ باطن کی روح سے منکشف ہوتے ہیں۔(یہ یہودی ربائیوں کے پھیلائے ہوئے عقیدے والا تصور ہے) یہ علم اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان علم بالحواس کے ذرائع بند کر کے اندر کی آنکھ کھول لے۔حالانکہ قرآن مجید میں باطنی معانی تلاش کرنا اس کے کلام کو منسوخ قرار دینے کا نہایت لطیف طریقہ ہے۔ اقبال نے اسی لئے رموزِ بے خودی میں کہا ہے

ے درشریعت، معنیءِ دیگر مجو ۔ غیرِ ضو، درباطنِ گوہر مجو ---- ایں گہر را خود خدا، گوہر گر است ۔ ظاہرش گوہر، بطونش گوہر است۔

قرآنِ مجید علم بالوحی کے بعد علم بالحواس یعنی ادراک ہی کو علم قرار دیتا ہے۔خِرد بافطرتِ روح الامین، اسلام کی بلیغ ترین، جامع اور حسین ترین تفسیر ہے۔قرآنی فکرامت کے قلب ونگاہ میں انقلاب کی متقاضی ہے اور انقلاب بڑی حوصلہ طلب کشمکش، جبر آزماہمت، اور جہادِ مسلسل چاہتا ہے۔اس کے برعکس تصوف بیٹھے بٹھائے فریبِ سکون کی جنت

کے دروازے کھول دیتا ہے۔الغرض تصوف اسلام کی سر زمین میں اک اجنبی پودا ہے۔قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا مطیع اور محکوم نہیں ہوتا۔سب خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔اس سے انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔صوفیانہ تکیوں یا خانقاہیت کی تجربہ گاہوں میں انسانی ذات کی نشو ونما نہیں ہو سکتی۔وہ تو دنیا میں نفس کشی کو مقدس ترین مقصد، اور آخرت میں اپنی ذات کو ذاتِ خداوندی میں فنا کر دینے کو منتہائے حیات قرار دیتے ہیں۔حالانکہ قرآن فرماتا ہے۔ فا دخُلیٰ فی عبادیِ وادخُلی جنتی ، یعنی معاشرہ کے اندر زندگی بسر کرنا بنیادی شرط ہے۔

اسلامی نظریہءحیات:

اور مقصودِ زندگی یہ ہے: ۱۔ خدا کی حقیقت وماہیت انسانی تصور، شعور، یا ادراک سے ماورا ہے۔ ۲۔ کائنات اور انسان خدا کی مخلوق ہیں۔۳۔ انسان مادی جسم اور انسانی ذات پر مشتمل ہے۔جسم کی پرورش خدا کے مقرر کردہ قوانین کی رُو سے ہوتی ہے۔اور انسانی ذات کی نشو ونما اقدارِ خداوندی کے اتباع سے، جو خدا نے وحی کے ذریعے عطا فرمائیں۔ ۴۔ انسان کے اعمال تو اس کے اعضائے جسمانی کے ذریعے سرزد ہوتے ہیں لیکن ان کی محرک اور ذمہ دار اُس کی ذات ہوتی ہے۔ ۵۔ انسان کی ذات اس کی موت سے فنا نہیں ہوتی بلکہ موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اور اپنے رجحان وصلاحیتوں کے مطابق سزا وجزا پاتی ہے۔ ۶۔ انسانی جد وجہد کا مقصد فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انھیں اقدارِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرنا ہے۔اس سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے۔اس کا ذریعہ تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ ۷۔ یہ مقصد ایک اجتماعی نظام مملکت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن اپنی تعلیم اور پیام کو علم البصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور مدلل براہین کی روشنی میں منواتا ہے۔ جبکہ تصوف علم وعقل اور دلیل وبرہان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ قرآن کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے، جبکہ تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ یہ کائنات باطل ہے، اس کا درحقیقت وجود ہی نہیں لہٰذا فطرت کی قوتوں اور ان کی تسخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔قرآن چاہتا ہے کہ ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جس کی رُو سے قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے فطرت کی ان قوتوں کو نوعِ انسانی کی منفعت، بہبود اور نشو ونما کے لیے اس طرح استعمال میں لایا جائے کہ یہاں کی زندگی بھی کامیابیوں کی ہو اور انسان آخری زندگی کی کامرانی کے بھی قابل ہو جائے، جبکہ تصوف کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصد محض ایک فردی رُوحانی ترقی ہے جو مختلف قسم کے مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔اس میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں۔کشف والہام وکرامات اِسی انفرادی روحانی ترقی کے مظاہر ہیں۔

یہ ہے اسلامی تعلیم اور تصوف کے نظام کا تقابل۔اب دیکھئے کہ تصوف کی ایک ایک شق کس طرح قرآنی پیغام اور نظام کی ضد ہے۔ تصوف اور غیرِ تصوف میں خطِ امتیاز ہی یہ ہے کہ تصوف باطنی علم کو حقیقت قرار دیتا ہے۔اور اس کے سوا ہر علم کو دھوکا اور فریب۔حتیٰ کہ وہ ارکانِ اسلام کو بھی ظواہر پرستی سے تعبیر کرتا ہے۔اس سے اندازہ لگالیں کہ تصوف کی رُو سے قرآن اور علمِ انسانی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

اکابر صوفیاء کے ارشادات وکرامات

تصوف کے عقائد اور تصورات کو عام کرنے میں مولینا روم (پیدائش ۶۰۴ھ بمقام بلخ، وفات ۶۷۳ھ) کا نمایاں حصہ ہے۔ان کی مثنوی لطائف، استعارات، تشبیہات، تمثیلات اور حکایات سے بھری ہے۔تصوف کا مظہری معراج کرامات ہوتی ہیں، لیکن مقامِ حیرت ہے کہ جس قسم کی کرامات کا ذکر ہمارے بلندترین اولیاءاللہ کے ہاں ملتا اور دکھائی دیتا ہے، سادھو اور سنیاسی وغیرہ بھی ایسی ہی بلکہ بعض اوقات اِن سے بھی زیادہ حیرت انگیز کرامات دکھا دیتے ہیں۔مغرب میں ہپناٹزم اس سے بڑھ کر حیرت انگیز مظاہرے دکھا رہا ہے۔وہ لوگ بیہوش یا سُن کئے بغیر بڑے بڑے اپریشن کر لیتے ہیں۔جبکہ ہمارے یہاں دانت کا درد روک دینے والا بھی ولی اللہ کہلانے لگتا ہے۔ ہمارے صُوفیاء سے منسوب چند کرامات ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ابراہیم بن ادہم متوفی ۱۶۲ھ، ایک دن شکار کو گئے اور ایک ہرن کے پیچھے لگ کر لشکر سے بچھڑ گئے۔ہرن نے عربی میں آپ سے کہا، کیا تم اسی لئے پیدا کئے گئے ہو، کیا تمہیں اسی کام کا حکم دیا گیا ہے؟ یہ سنتے ہی دنیا ترک کر دی، اور زہد وورع کے پابند ہو گئے۔(روایت حضرت علی ہجویری)

حضرت بایزید بسطامی متوفی ۲۶۱ھ نے فرمایا سبحانی! ما اعظم شانی۔ میں پاک ذات ہوں۔میری شان کا کیا پوچھنا۔مزید یہ کہ میں نے تو بحرِ معرفت میں غوطہ لگا لیا اور انبیاء اس کے ساحل پر کھڑے رہے، اور، مُلکی اعظمُ من مُلک اللّٰہ۔میری بادشاہت خدا کی بادشاہت سے عظیم تر ہے۔(روایت حضرت علی ہجویری)۔

حضرت عبدالقادر جیلانی متوفی ۵۶۱ھ المعروف غوثِ اعظم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وعدہ فرما لیا ہے کہ میرے مریدوں، سلسلہ والوں، میرے طریق کا اتباع کرنے والوں اور میرے عقیدت مندوں کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ نیز فرمایا، دیکھو میرا دستِ حمایت میرے مریدوں پر ایسا ہے جیسا آسمان زمین پر۔اگر میرا مرید اچھا نہیں تو کیا ہوا، میں تو اچھا ہوں۔جلالِ پروردگار کی قسم، جب تک میرے تمام مرید بہشت میں نہیں چلے جائیں گے میں بارگاہِ خداوندی میں نہیں جاؤں گا۔ ماشاءاللہ۔ (روایت حضرت خواجہ عبدالحق محدث دہلوی)۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے فرمایا، حضرت مودود چشتی کو جب خانہ کعبہ کی زیارت کا اشتیاق غالب آتا تو فرشتے خانہ کعبہ کو سرزمینِ چشت میں لے آتے تا کہ خواجہ مودود چشتی زیارتِ خانہ کعبہ سے مشرف ہو سکیں۔(روایت حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر)۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء متوفی ۷۲۵ھ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت یوسفؑ نے حضرت یعقوبؑ کو دیکھ کر گھوڑے سے اترنے میں ذرا دیر لگا دی۔اِس پر جبرائیل تشریف لائے اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ تم نے گھوڑے سے اترنے میں دیر لگا دی ہے اس لئے تمہاری اولاد میں کوئی نبی نہ ہو گا۔حضرت سلیمانؑ کے متعلق فرمایا کہ ان کے باورچی خانہ میں ستر ہزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے اور وہ روزانہ خرچ ہو جاتا تھا۔(روایت حضرت امیر خسرو)۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ اپنے چچا مولینا ابوالرضا محمد کے متعلق لکھتے ہیں انھوں نے فرمایا، ایک مرتبہ میں اپنے اسمائے صفات کی طرف متوجہ ہوا تو ننانوے ناموں سے بھی زیادہ پائے۔کچھ اور توجہ کی تو چار ہزار سے زیادہ پائے۔پھر اور تجسس کیا تو اپنے اسمائے صفات کی کوئی حد شمار نہ پائی۔جب اس مقام پر پہنچا تو اپنی ذات کو اس حالت میں دیکھا کہ میں کائنات کو پیدا بھی کر رہا ہوں اور مار بھی رہا ہوں۔ (روایت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر متوفی ۶۷۰ھ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک بنجارہ گزرا جس کے بوروں شکر لدی ہوئی تھی۔آپ نے پوچھا کہ بوروں میں کیا ہے، تو اس نے مذاق سے کہا کہ نمک ہے۔گھر جا کر بورے کھولے تو ان سب میں نمک ہی نمک تھا۔وہ روتا ہوا حاضرِ خدمت ہوا تو فرمایا کہ بہت اچھا۔وہ شکر تھی تو شکر ہو جائے گی۔چنانچہ وہ شکر بن گئی۔ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ شیخ جلال الدین رومی کبھی رُوم میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔جب نماز کا وقت آتا تو آپ غائب ہو جاتے۔آخر معلوم ہوا کہ آپ شرعی اور تعظیمی طور پر خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں۔(روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء)۔ ایک دفعہ ایک جوگی بابا فرید کی خدمت میں آیا۔آپ نے

اسے کہا کوئی کرامت دکھاؤ۔ یہ سن کر وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ آپ نے اپنی جوتیاں ہوا میں چھوڑ دیں۔ وہ اُس جوگی کے سر سے اونچی چلی گئیں چنانچہ جوگی آپ کے مرتبے کا قائل ہوگیا۔ (یہ کہانی کئی اولیاءاللہ سے منسوب کی جاتی ہے)۔ پھر بابا فرید نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب خواجہ قطب الدین مودود چشتی کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں نے چاہا کہ جنازہ اٹھائیں تو جنازہ خود بخود معلق ہو کر چلنے لگا۔ دفن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنازہ کو فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ (روایت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء)۔

حاجی خواجہ قطب فرید، حق فرید یا فرید: کہا جاتا ہے کہ بابا فرید کسی کشتی یا پُل کے بغیر پانی پر سیدھے چلتے ہوئے دریا عبور کیا کرتے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کا ایک مرید بھی اسی طرح پار کر جاتا۔ مرید کو انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ پانی پر چلتے وقت یا فرید یا فرید پکارتے رہا کرو۔ ایک دن پانی پر چلتے مرید نے سن لیا کہ بابا فرید خود تو زیر لب یا اللہ کا ورد کر رہے ہیں، تو اس نے بھی یا اللہ یا اللہ شروع کر دیا، لیکن جونہی یا اللہ کہا، دھڑام سے پانی میں گر کر غوطے کھانے لگا۔ بابا فرید نے اسے سنبھالا اور کنارے پر کھڑے لوگوں نے پوچھا کہ آج کیا ہوا تھا؟ اس نے ڈرتے ڈرتے بات بتائی تو بابا فرید نے فرمایا کہ تم نے کبھی اللہ کو دیکھا ہے؟ کیا تمہاری اس سے براہ راست کوئی راہ و رسم ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جس سے تمہاری جان نہ پہچان، نہ راہ و رسم، اُسے تم اپنی مدد کے لیے کس طرح پکار سکتے ہو؟؟ فرید کی خدا سے راہ و رسم ہے اس لیے وہ اسے پکارتا ہے۔ تمھاری فرید سے راہ رسم ہے تم اسے پکارو۔ جس دن تمھاری راہ و رسم خدا سے براہ راست ہو جائے گی تم بھی اسے پکار لینا۔ (یہ کہانی بھی کئی اولیا سے منسوب کی جاتی ہے)
بابا فرید کی ایک اور داستان مشہور ہے کہ ایک دفعہ بابا فرید گنج شکر کا ایک مرید ان کی خدمت میں قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت کے ہاتھ میں اس وقت مٹی کا ایک لوٹا تھا۔ انھوں نے مرید کو دیکھتے ہی لوٹے کو اس طرح پھینک دیا جیسے کسی کو دے مارتے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ لوٹا تھوڑی دور جا کر زمیں پر گر پڑے، وہ ہوا میں غائب ہو گیا۔ بہت دنوں کے بعد حضرت کے مریدوں کا ایک قافلہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی قافلے نے آپ کے سامنے مٹی کے چند ٹھیکرے پیش کیے۔ مُرید مذکور نے موقعہ پا کر قافلے والوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایران سے آرہے تھے اور بلوچستان میں سفر کر رہے تھے کہ راستے میں دفعتاً ایک شیر نے ہم پر حملہ کیا۔ ہم نے بارگاہِ الٰہی میں سلامتی کی دعا کی، جس کا فوراً یہ نتیجہ ہو کہ ایک مٹی کا لوٹا شیر کے سر پر پڑا، اور وہ بھاگ گیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ ہمارے حضرت کی کرم فرمائی ہے۔ (لاحول ولاقوۃ)

لہٰذا ان

ٹھیکروں کو تبرک جان کر ہم ساتھ لے آئے اور یہاں پہنچ کر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔

یہ اور اس قسم کی حکایات ابتدا ہی سے مریدوں کو ذہن نشین کرا دی جاتی ہیں کہ تم خدا سے اپنا براہ راست رشتہ جوڑ ہی نہیں سکتے (ہندو پنڈت بھی عوام کو یہ ہی کہتے ہیں) ۔ اولیاء اللہ مرنے کے بعد بھی اللہ سے رابطہ میں رہتے ہیں اور مریدوں کی مدد کو آتے ہیں۔ (ہندو پنڈت بھی عوام کو یہ ہی کہتے ہیں)

ممتاز صوفیاء کے اسماءِ گرامی

حضرت ابراہیم بن ادہم	متوفی ۱۶۲ھ
حضرت رابعہ بصری	متوفیہ ۱۸۵ھ
حضرت معروف کرخی	متوفی ۲۰۶ھ
حضرت ذوالنون مصری	متوفی ۲۴۵ھ
حضرت سری سقطی	متوفی ۲۵۹ھ
حضرت بایزید بسطامی	متوفی ۲۶۱ھ
حضرت سہیل بن عبداللہ تستری	متوفی ۲۸۳ھ
حضرت جنید بغدادی	متوفی ۲۹۸ھ
حضرت منصور حلاج (انا الحق)	متوفی ۳۰۹ھ (حلول)
حضرت ابوبکر شبلی	متوفی ۳۳۴ھ
حضرت ابراہیم بن شعبان (ابواسحٰق)	متوفی ۳۴۸ھ
حضرت ابوالقاسم قشیری	متوفی ۳۷۲ھ
حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش)	متوفی ۴۶۵ھ
حضرت امام غزالی	متوفی ۵۰۵ھ
حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی	متوفی ۵۶۱ھ (غوث اعظم)
حضرت شیخ فریدالدین عطار	متوفی ۵۷۲ھ
حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری	متوفی ۶۳۳ھ
حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی	متوفی ۶۳۸ھ (اندلس) (وحدت الوجودی)
حضرت جلال الدین تبریزی	متوفی ۶۴۲ھ (بنگال)
حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر	متوفی ۶۷۰ھ
حضرت مولیٰنا جلال الدین رومی	متوفی ۶۷۳ھ (وحدت الوجودی) پیدائش ۶۰۴ھ بمقام بلخ
حضرت شیخ بہاءالدین ذکریا (ملتانی)	متوفی ۶۶۶ھ
حضرت علاءالدین صابر (کلیئر)	متوفی ۶۹۰ھ
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء	متوفی ۷۲۵ھ
حضرت شیخ جلال الدین مخدوم (جہانیاں)	متوفی ۷۸۵ھ
حضرت شاہ جلال (یمنی) آسام	متوفی ۷۸۶ھ
حضرت سید علی ہمدانی (کشمیر)	متوفی ۷۹۱ھ
حضرت خواجہ باقی باللہ	متوفی ۱۰۱۲ھ
حضرت مجدد الف ثانی سرہندی	متوفی ۱۰۳۴ھ (وحدت الشہودی)
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	متوفی ۱۱۷۶ھ
حضرت محمد گیسو دراز (بلگام)	متوفی ؟؟
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی	متوفی ؟؟

مدارج

تصوف میں مختلف عہدیدار مانے جاتے ہیں جو سب مدارج مشکل کشائی کرتے ہیں۔

قطب	ایک	
عمود	تین یا چار	
اوتار	سات	
ابدال	چالیس	
نجیب	ستر،	اور
نقیب	تین سَو	ہوتے ہیں

******

قطب، غوث اور ابدال وغیرہ کا یہ نظام ہمارے یہاں تصوف کا مستقل جزو بن چکا ہے، اور یہ عقیدہ ہے کہ یہ مدفون حضرات دعائیں سنتے، مرادیں پوری کرتے، حالات سے باخبر رہتے، اور ضرورت کے وقت مدد کو پہنچتے ہیں۔

******

****

اوپر دیے گئے خیالات اس موضوع پر میری ذاتی رائے ہے۔ قارئین کا اس سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ بہت بڑی اکثریت تصوف اور صوفیاء کا احترام کرتی ہے اور میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہے۔ بس اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے۔